ڈاکٹر محمد نوید ازہر
شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور

یونانی فلسفہ میں سرّیت کے عناصر

Dr Muhammad Navid Azhar

Urdu Deptt, Govt. Islamia College Civil Lines, Lahore

Mystic Elements in Greek Philosophy

Mysticism is a great part of Greek philosophy. At first, Pythagoras has enlightened the candle of spirituality in Greek philosophy. Socrates & Plato had also developed mysticism in Greece. Plato's theory of "World of Ideas" is acceptable in Islam also. Plotinus, an Egyptian philosopher is a narrator of theory of "Emanation" which is presented by Plato. The article analyses the mystic elements in Greek philosophy.

آثارِ علمی کے وساطت سے جن تہذیبوں کے ساتھ ہمارا اولین رابطہ استوار ہوتا ہے۔ قدیم یونانی تہذیب ان میں سے ایک ہے جس کے فلسفی طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی غور وفکر میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ فلسفہ کی اولین تاریخ ہے۔ لازماً یہ تاریخ ایک فکری تسلسل کے ارتقاء کی نشان دہی کرتی ہے جس کے ابتدائی نقوش دست بُردِ زمانہ کی نذر ہو کر ہماری دسترس میں نہیں رہے۔ جن نقوش تک انسان کی رسائی ہو سکی ہے وہ یورپی تہذیب کا سرچشمہ قرار پائے ہیں۔ دو ہزار برس تک یورپ کے فلاسفہ یونانی فکر کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکے۔ ہر بعد میں آنے والے فلسفی نے حکمائے یونان خصوصاً افلاطون اور ارسطو کے اثرات کو قبول کیا ہے اور اکثر نے ان کی حکمت سے خوشہ چینی کی ہے۔ اہلِ اسلام جو رنگ و نسل اور زمان و مکان کے امتیاز سے بالاتر ہو کر علم و حکمت کو گم گشتہ میراث سمجھتے ہیں، انہوں نے بھی یونانی فلسفہ کو سمجھنے کی قابلِ قدر کوششیں کی ہیں۔ مسلمان حکماء نے یونانی حکماء کی کتابوں کے تراجم کیے، تشریحات لکھیں اور انہیں اپنے فکری قالب میں ڈھال کر پیش کیا، جس سے مسلمانوں میں بھی ان افکار و نظریات سے دل چسپی کا رجحان پیدا ہوا۔ یہی وہ اسباب ہیں جو ادبِ عالم میں یونانی فلسفہ کی ضرورت و اہمیت کو دو چند کر دیتے ہیں۔

قدیم یونانی معاشرہ دیومالائی مذہب کا پیروکار تھا۔ مظاہرِ فطرت کی طرح دیوتاؤں کی تعداد بھی بے شمار تھی۔ ان کے خیال میں مختلف دیوتا مختلف قدرتوں کے حامل ہونے کے باوجود ایک ہی خدائی خاندان کی وحدت سے منسلک تھے۔ اس خدائی خاندان کی اقامت گاہیں آسمان پر فرض کی گئی تھیں۔ ''زیوس'' (Zeus) اس خاندان کا سربراہِ اعلیٰ یا رب الارباب تھا۔ یہ بجلی کا

دیوتا تھا۔ دھرتی دیوی ''ہیرا'' اس کی بیوی اور شادی کی دیوی تھی۔ سورج اور روشنی کا دیوتا ''اپالو'' جب کہ سمندر اور زلزلہ کا دیوتا ''پوسائیدون'' تھا۔ ''ایتھنا'' زیوس کی بیٹی، عورتوں اور ذہانت کی دیوی تھی۔(۱) ایڈولف ہولم کے مطابق یونانی مذہب میں ان مظاہر فطرت کو معبود بنالیا گیا تھا جن کے حسن، مفاد یا خوف سے انسان متاثر یا مرعوب ہوتا ہے۔(۲)

ہومر (آٹھویں صدی قبل مسیح) کی ایلیڈ (Illiad) اور اوڈیسی (Odyssey) میں ہمیں اس دیوتا پرستی کی ایک واضح جھلک نظر آتی ہے۔(۳) الفرڈ ویبر کے خیال میں یونانیوں کا دیوتاؤں کے بارے میں عقیدہ یہ تھا کہ دیوتا انسان سے زیادہ طاقت ور ہستیاں ہیں لیکن مطلقاً غیر فانی نہیں۔ وہ انسانوں کی بہ نسبت طویل العمر ہوتے ہیں۔ دیوتاؤں کے زیادہ قوی اور دانا ہونے کی وجہ سے ہمیں ان کا احترام کرنا چاہیے۔ یہ ہستیاں کتنی ہی طاقت ور کیوں نہ ہوں ایک ایسی چیز بھی ہے جو ان سے زیادہ طاقت ور ہے یعنی تقدیر یا وہ اعلیٰ غیر شخصی اور غیر جانب دار قانون جو ارض و سماوات پر حاکم ہے۔(۴) اس دیومالائی ضعف اعتقاد کے دور میں فلاسفۂ یونان نے ایک ایسے شاندار نظام فکر کی بنیاد ڈالی جو آنے والے وقتوں کی ایک کلامی روایت بن گیا۔

مصر کی حکمت و دانائی کو یونان پر فضلِ تقدم حاصل ہے۔ بہت سے شعبہ ہائے علم مثلاً ریاضیات، ہیئت اور علم طب میں یونانی افکار پر مشرق اور خصوصاً مصر کی تہذیب کے بہت بڑے اثرات کا ثبوت ملتا ہے۔ تاہم فلسفہ کی باقاعدہ اور حکیمانہ ترقی اہل یونان کی خصوصیات میں سے ہے۔ یونانی فلسفہ کے آغاز سے قبل ہی اہل بابل اور اہلِ مصر علم کا ایک گراں قدر ذخیرہ جمع کر چکے تھے۔ جس میں فلسفیانہ خیالات و نظریات موجود تھے۔ اہلِ یونان نے انہی معلومات کو اپنے استعمال میں لاکر ارتقاء کا سفر آگے بڑھایا۔(۵) مصر اور عراق میں تہذیب کی ابتدائی نشوونما نیل، دجلہ اور فرات کے دریاؤں کے باعث ہوئی۔ مصری اور بابلی تہذیب نمایاں طور پر ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ مصری موت کے خیال میں محو رہتے تھے۔ ان کے عقیدے کے مطابق مردوں کی ارواح زیر زمین چلی جاتی تھیں جہاں اوسیریز (Osiris) کے سامنے ان کے دنیوی اعمال کا حساب ہوتا تھا۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ روح دوبارہ بدن میں لوٹ آتی ہے۔(۶)

فلسفہ یونان کو رپیوپارٹ کے خیال میں تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن میں ایک تدریجی ارتقائے عقلی پایا جاتا ہے:

۱۔ کونیاتی (Cosmological)

۲۔ انسانیاتی (Anthropological)

۳۔ تنظیمی (Systematic)

فطریت کا دور کونیاتی، سقراط اور سوفسطائیہ کا دور انسانیاتی جب کے افلاطون کا دور تنظیمی کہلاسکتا ہے۔(۷)

فلسفۂ یونان کا آغاز ''فطریت'' یا ''مادیت'' کے نظریے سے ہوا، جس کے تحت یونانیوں نے اس عالمِ فطرت کو غور و فکر کا محور و مرکز بنایا۔ ان فلاسفہ نے مبداءِ عالم یا مادۂ کائنات کی ماہیت کی دریافت کے بارے میں اساسی تصورات قائم کیے۔ اس لحاظ سے یونان کے ابتدائی فلاسفہ کو طبیعیاتی یا سائنسی کہا جاسکتا ہے۔ گویا یہ کونیاتی دور تھا۔

اس فطریت اور مادیت کا بنیادی سبب دیومالائی توہمات اور نظریات تھے۔ قدیم انسان کے لیے خارجی کائنات ناقابلِ فہم تھی۔ وہ زلزلوں، برق و باراں کے طوفانوں اور آسمانی و زمینی آفتوں سے خوف زدہ ہوکر خود کو بے بس محسوس کرتا اور اس کائنات کی حقیقت و ماہیت پر غور کرنے کی سعی کرتا۔ اسی خوف و دہشت نے دیومالا کو جنم دیا، جس کے تحت ان ناگہانی بلاؤں کو

انسان نے دیوتاؤں کے غیظ وغضب کا اظہار سمجھا اور عالمِ فطرت میں وقوع پذیر ہونے والے تغیرات کے فہم کی کوشش کی۔

آرفی مت کے ذریعے اس مادیت میں روحانیت کی کرن پھوٹی۔ آرفی مت کی بنیاد جسم اور روح کی ثنویت پر تھی۔ آرفیئسی بدن کو روح کا گھر نہیں بلکہ زنداں سمجھتے تھے۔ ترکِ خواہشات اور نفس کشی کی تعلیم دیتے تھے۔ آخرت کی زندگی کو حقیقی زندگی گردانتے تھے اور بقاے دوام کے لیے پرہیزگاری اور مجاہدۂ نفس کی تلقین کرتے تھے۔ آرفی مذہب بقاے روح کا قائل تھا اور تناسخِ ارواح پر زور دیتا تھا۔ زیلر کے خیال میں آرفی مت ہندوستان کے نظریہ تناسخ ہی کی ایک شکل تھا۔(۸)

جس فلسفی کے ذریعے فلسفۂ یونان میں صوفیانہ رجحانات داخل ہوے وہ آرفی مت کا ایک مصلح فیثاغورث (۵۸۰۔۵۰۰ ق م) تھا۔ اس نے اطاعت، مراقبہ، سادہ غذا اور سادہ لباس کی ضرورت پر زور دیا۔ ہیگل کے بہ قول وہ ایک شان دار شخصیت اور کچھ معجزانہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ تناسخِ ارواح پر یقین کامل رکھتے ہوے اس نے اپنے بارے میں بھی کہا کہ وہ کسی سابقہ جنم میں جنگِ ٹروجن کا جنگ جو یوفوربس تھا اور اسے اجازت ملی کہ وہ اپنے سابقہ جنموں کا حافظہ اس زمینی زندگی میں ساتھ لاے۔(۹)

قفطی نے لکھا ہے کہ جب سلیمان بن داؤد علیہا السلام کے اصحاب شام سے مصر میں آے تو فیثاغورث نے ان سے حکمت سیکھی۔ اس سے پہلے وہ اہل مصر سے علم ہندسہ کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ اس نے عددی نسبتوں سے نغموں میں توازن قائم کیا اور دعویٰ کیا کہ اس نے یہ نورِ علم چراغ نبوت سے حاصل کیا ہے۔ وہ اس عالم مادی سے آگے ایک لطیف، روحانی اور نورانی دنیا کا وجود تسلیم کرتا تھا۔ جہاں صرف ان لوگوں کی رسائی ہوسکتی ہے جو غرور، حسد، ریاکاری اور دیگر برائیوں سے پاک ہوں۔(۱۰) فیثاغورث کے ہاں خالص سائنسی اور منطقی فکر صوفیانہ رجحانات کے ساتھ آمیز ہے۔ راہبانہ طرز زندگی اختیار کرنے کے باوجود فیثاغورث اور اس کے پیروکاروں نے فلسفہ اور ریاضی کو فروغ دیا۔ Mathematics کی اصطلاح بھی اسی نے ایجاد کی۔ فیثاغورثیوں کے نزدیک اشیاے کائنات کا اصل سرچشمہ یا جوہر عدد تھا۔(۱۱) فیثاغورث کے مطابق فکر حس سے افضل ہے اور معقولات محسوسات سے زیادہ حقیقی ہیں۔(۱۲) لفظ ''فیلسوف'' یا فلسفی (محبّ دانش) فیثاغورث ہی کا وضع کردہ ہے۔ اس کے خیال میں مسلسل فلسفیانہ غور وفکر سے جو شخص جنم چکر سے نجات حاصل کر لیتا ہے وہی فلسفی ہے۔ فیثاغورث نے کہا کہ اعداد حقیقی، ازلی، ابدی اور زمان ومکان سے ماوراہیں۔(۱۳)

بہ تدریج یونان کے فلسفیانہ تفکر نے اپنا زاویۂ نگاہ بدلا اور باطن کی طرف توجہ دیتے ہوے افعالِ انسانیہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اب موضوعِ فکر انسان کے باطنی حیات، تعقل وارادہ اور اعمالِ ذہنیہ وغیرہ کو قرار دیا گیا۔ اس دور میں نفسیات، منطق اور اخلاقیات کا آغاز ہوا۔ اس دور کے نمائندہ مکاتب فکر سقراطی اور سوفسطائی ہیں۔ اگرچہ سقراط (۴۶۹۔۳۹۹ ق م) نے سوفسطائیوں کی طرح انسان کو موضوع بحث بنایا تاہم وہ سوفسطائیوں کا مخالف تھا اور جلبِ زر کی وجہ سے انہیں حقارت سے دیکھتا تھا۔(۱۴) سقراط نے عرفانِ خویش کی تعلیم دی ہے۔ اپالو کے مندر میں تحریر تین آفاقی سچائیوں میں سے ایک سقراط کا یہ مشہور مقولہ بھی ہے:

"Know thyself " (۱۵)

''اپنی خودی پہچان''

الفرڈ ویبر کے خیال میں:

> سقراط کا کمال یہ ہے کہ اس نے کم از کم اخلاقیات میں جزئی کو کلی سے علیحدہ کرنے کے کوشش کی۔ انسانوں کی بے انتہا بوقلمونی میں اس نے غیر متغیر انسان کو دیکھ لیا۔ ایک تباہ حال اخلاق صدی کے مخلوط انبارِ آراء میں سے اس نے ایک غیر متبدل اور سچی رائے کو تلاش کر لیا جو نوع انسان کے ضمیر یا نفوس کا قانون ہے۔ اس لحاظ سے سقراط نے صرف اخلاقیات ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ الٰہیات کو بھی اس سے بہت فائدہ پہنچا۔ (۱۶)

سقراط نے انسان کے مقصد حیات پر غور کیا ہے اور خیر و شر کے فلسفے پر گفتگو کی دعوت دی ہے۔ اس نے علم اور حصول علم کے بارے میں سوال اٹھایا ہے۔ محمد سلیم الرحمٰن کے بہ قول سقراطی طریق کار کا بنیادی نقطہ اپنے مخاطب کو اس کی لاعلمی کا احساس دلانا تھا۔ اس کے نزدیک لاعلمی کا اعتراف حصولِ علم کی جانب پہلا قدم تھا کیوں کہ اپنے علمی زعم میں مبتلا شخص حصولِ علم پر آمادہ ہی نہیں ہو سکتا۔ سقراط لوگوں سے سوال و جواب کر کے انہیں یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ محض جاہل بلکہ اجہل ہیں۔ (۱۷)
سقراط کا قول ہے:

> میں دوسروں سے زیادہ جانتا ہوں
>
> میں جانتا ہوں
>
> میں کچھ نہیں جانتا (۱۸)

پال ژانے کے خیال میں سقراط نے فلسفے کو آسمان سے زمین پر اتارا اور اسے شہروں اور گھروں میں داخل کیا۔ اس نے فلسفے کا رخ کائنات سے سیاسی اور اخلاقی مسائل کی طرف موڑا لیکن وہ صرف علم اخلاق کا بانی نہیں کیوں کہ اس کا فکری طریقِ کار بیس صدیوں تک ذہن انسانی کی رہنمائی کرتا رہا۔ اس کے نزدیک علم کی غایت اس دائمی اصول کی دریافت ہے جو جزئی اور حادث اشیا کے تحت پایا جاتا ہے۔ یہ دائمی عنصر کلی تعقل یا تصور ہے اور علم کی غایت اس کی تعریف کا کھوج لگانا۔ (۱۹)

سقراط زندگی بھر دنیا کی رنگینیوں سے کنارہ گیر رہا۔ شرک اور بت پرستی سے اسے شدید نفرت تھی۔ اس نے کئی مرتبہ یونانی پادریوں سے بت پرستی پر مناظرہ کیا اور انہیں شکست دی۔ اسی وجہ سے انہوں نے عوام و خواص کو سقراط کے خلاف بھڑکا دیا اور بادشاہ وقت سے اس کے لیے سزائے موت طلب کی۔ بعض کے نزدیک اس کی سزائے موت کا سبب یہ واقعہ بنا کہ ایک روز بادشاہ اس کے قریب سے گزرا اور اسے بے نیاز پا کر اس سے یوں مخاطب ہوا: ''تم جانتے نہیں ہو کہ میں تمہارا آقا ہوں اور تم میرے غلام ہو۔'' سقراط نے جواب دیا: ''تم غفلت میں ہو، حرص اور شہوت میرے غلام ہیں اور تم ان کے غلام۔ اس طرح تم میرے غلام در غلام ہو۔'' اس جواب نے بادشاہ کو غضب ناک کر دیا۔ سقراط کے موحد ہونے کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ ایک دفعہ کسی نے سقراط سے پوچھا: کون سی چیز تخلیق کائنات کا سبب بنی۔ اس نے جواب دیا: ''اللہ کا جود و کرم۔'' (۲۰)

سقراط بقائے روح کا قائل تھا اور روح کی عظمت کے بارے میں پختہ یقین رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک انسان کے لیے وجہِ شرف امارت، اقتدار یا شہرت نہیں بلکہ صفائے روح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے پاس روح سے بیش بہا کوئی چیز نہیں۔ اس لیے انسان کا سب سے بڑا فرض روح کی نگہداشت ہے۔ (۲۱) ''اپالوجی'' وہ تقریر ہے جو اس نے اپنے سزائے موت کے مقدمہ کے دوران میں اپنے دفاع میں کی۔ اس نے کہا:

خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے اور دوسروں کے باطن کی تلاش کا فلسفیانہ مشن پورا کروں۔ موت کا خوف دانائی نہیں کیوں کہ کوئی نہیں جانتا کہ شاید موت اس کے حق میں برتر خیر ہو۔ اگر اس شرط پر میری جان بخشی جائے کہ فلسفیانہ مشن کو ترک کر دوں تو میرا جواب یہ ہوگا کہ ایتھنز کے لوگو! میں تمہارا احترام کرتا ہوں اور تم سے محبت کرتا ہوں لیکن میں تمہاری بجائے خدا کی اطاعت کرتا ہوں۔ جان لو! یہ حکمِ خداوندی ہے۔ (۲۲)

سقراط کے ان موحدانہ خیالات سے یہ گمان گذرتا ہے کہ شاید وہ فرستادگانِ خدا میں سے تھا جو اپنے عہد کے بت پرست انسانی معاشرہ میں پیغمبرانہ شان کے ساتھ جلوہ گر ہوا اور اعلائے کلمۃ الحق کی پاداش میں گردن زنی کی سزا کا مستحق ٹھہرا۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ''سرگذشتِ فلسفہ'' میں سقراط کے نبی ہونے کے خیال کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یونان کے عروجِ ثقافت کے اس تاریک دور میں سقراط فکر و نبوت کی نورانی مشعل لے کر نمودار ہوا، جس کی امواجِ نور نے فکرِ یونانی کی اس خود فریبی کا دامن تار تار کر دیا اور لوگوں کو صحیح خطوط پر سوچنے، خیر و شر اور حسن و قبح میں امتیاز کرنے کے فطری معیار سے آگاہ کیا۔ (۲۳)

افلاطون اور ارسطو کی بدولت فلسفۂ یونان دورِ عروج سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اس دور میں ان دو فلسفیوں نے گذشتہ علم کی ترتیب و تنظیم کی اور فلسفہ کو ایک جامع و مانع نظام بنا دیا۔ افلاطون (۴۲۸۔۳۴۷ ق م) ابتدا میں شعر و شاعری کی طرف مائل تھا لیکن ایک روز سقراط سے یہ بات سنی کہ ''انسان کو حقائق کی تلاش کرنی چاہیے''۔ یہ جملہ فلسفے میں اس کی دل چسپی کا باعث بن گیا۔ اس نے شاعری ترک کر دی اور سقراط سے فیثا غورثی فلسفہ سیکھنے لگ پڑا۔ جہاں سقراط نے کوئی کتاب نہیں لکھی وہاں افلاطون سقراط کے برعکس کثیر التصانیف تھا۔ اپنے طلبہ کو فلسفہ پڑھانے کے دوران میں ٹہلتا رہتا۔ اس کے شاگرد بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے۔ چناں چہ اس جماعت کا نام ''مشّائیّین'' پڑ گیا۔'' (۲۴)

افلاطون کے مابعد الطبیعیاتی تصورات میں اس کا نظریۂ تصورات اہم ترین ہے۔ افلاطون کے خیال میں یہ عالمِ محسوس حقیقی نہیں۔ یہ ہر لحظہ تغیر کا شکار ہے۔ اس عالم مادی کے بالمقابل ایک اور عالم ہے جسے عالمِ مثال کہا جا سکتا ہے۔ عالمِ مثال حقیقی عالم ہے۔ اس عالمِ محسوس میں موجود تمام اشیاء، عالمِ مثال میں موجود تصورات کی نقل ہیں۔ عالمِ مثال میں موجود تصورات ثابت اور غیر متغیر ہیں۔ یہ صورِ ماہیات کلی، حقیقی، ازلی اور ابدی ہیں۔ کلی سے مراد وہ تصور ہے جس کا اطلاق ایک جیسی ماہیت رکھنے والی بے شمار چیزوں پر ہوتا ہے۔ افلاطون کے نظریۂ تصورات کی وضاحت میں الفرڈ ویبر لکھتے ہیں:

حقیقت اشیائے محسوسات یا مظاہر کا حصہ نہیں بلکہ تصورات اور ان کی مُثُل کا حصہ ہے جن کی نقل ان اشیاء میں پائی جاتی ہے۔ ان تصورات و مُثُل کا ادراک صرف عقل سے ہو سکتا ہے جو محلِ اعراض اور خود ذات ہے۔ مظاہر یا حادثات میں صرف اتنی ہی حقیقت ہے جتنی ان کو اس تصور مثالی سے ملی ہے جس کے وہ مثنیٰ ہیں۔ (۲۵)

افلاطون کے مطابق جب ہم روزمرہ زبان یا گفتگو میں انسان، کتاب یا گھوڑا کہتے ہیں تو اس سے مراد کوئی خاص انسان، کتاب یا گھوڑا نہیں ہوتا بلکہ ان چیزوں کے وہ تصورات ہوتے ہیں جو ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں۔ یہ تصورات ان خصوصیات پر مشتمل ہوتے ہیں جو تمام انسانوں، کتابوں یا گھوڑوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ افلاطون کے نزدیک یہ

تصورات صرف ہمارے ذہنوں میں ہی موجود نہیں ہوتے بلکہ عالم مثال میں ان کی ایک مستقل بالذات حیثیت ہے۔ میکش اکبر آبادی کے الفاظ میں:

> افلاطون کے نزدیک تصور کے معنی مثال کے ہیں یعنی کسی شے کی محض خارجی شکل نہیں بلکہ ان کی اصلی ہیئت یا نوعیت جو معروض حواس نہیں، بلکہ معروض فہم ہے۔(۲۶)

ڈاکٹر سی۔اے قادر کے خیال میں:

> تصورات سے مراد وہ خیالات نہیں جو انسانی ذہن کی پیداوار ہیں بلکہ ایسے سانچے، ماڈل یا کلیے ہیں جن کا وجود منطقی طور پر جزئیات سے قبل ہونا لازمی ہے۔(۲۷)

نظریۂ تصورات یا امثال کے بارے میں افلاطون کا استدلال یہ ہے کہ آئینے میں عکس تبھی پیدا ہوگا جب اس کے سامنے کوئی چیز ہوگی ورنہ نہیں۔ بعینہٖ انسانی ذہن میں کسی چیز کا تصور اس وقت پیدا ہوگا جب وہ چیز انسان کے سامنے ہوگی۔ لیکن اگر آئینے کے سامنے سے اس چیز کو ہٹا لیا جائے اور آئینے میں اس کا عکس پیدا نہ ہو تو کیا اس چیز کا اپنا وجود بھی ختم ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ وہ چیز آئینے میں منعکس نہ ہو تو بھی اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح اگر انسانی ذہن میں تصورات موجود ہیں تو وہ یقیناً معروضی طور پر بھی موجود ہیں۔ نیز جس طرح آئینہ ٹوٹ جانے سے چیز کا وجود ختم نہیں ہوتا، اسی طرح انسانوں کے ختم ہو جانے سے وہ تصورات فنا نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک مستقل وجود رکھتے ہیں۔(۲۸)

اس عالمِ آب و گل میں کسی چیز کا وجود زمان و مکان سے ماورا نہیں ہے۔ جو چیز یہاں موجود ہے وہ کسی مخصوص زمان اور کسی مخصوص مکان میں موجود ہے۔ ورنہ اس کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ کسی موجود چیز کی اپنی ایک فردیت ہے، جس کے ساتھ وہ موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ایک مخصوص اور متعین چیز ہے۔ اس چیز کا یہ تخصص اور تعین زمان و مکان کی پابندیوں کی وجہ سے ہے۔ تصورات فردیت سے آزاد ہیں کیوں کہ فردیت کا تعلق زمان و مکان کی پابندیوں سے ہے۔ اگر تصورات فرد ہوں تو کسی نوع کے لیے ان کا اطلاق ممکن نہیں رہے گا۔ وہ متشخص ہو جائیں گے۔ مثلاً انسان کا تصور اگر متشخص ہو جائے تو پھر نوعِ انسانی پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکے گا۔ اس کے معانی مخصوص اور متعین ہو جائیں گے۔ اس استدلال سے افلاطون نے یہ فرض کر لیا کہ اس عالمِ مادی سے ماورا ایک ایسا عالم ہے جہاں یہ تصورات یا امثال معروضی طور پر موجود ہیں۔ وہ عالم زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس کا حسی ادراک ناممکن ہے۔ وہ اس کائنات کی آخری حقیقت ہے۔ وہ عالم تصورات متعدد تصورات کے باوجود ایک وحدت ہے کیوں کہ تصورات باہم مربوط ہیں۔ اوپر کی طرف سفر کرتے ہوئے تمام تصورات اپنے سے اعلیٰ تر تصور میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ صرف اعلیٰ ترین تصور رہ جاتا ہے اعلیٰ ترین تصور ''خیر'' (The Good) ہے۔ تمام تصورات اس میں مدغم ہیں۔ اسی سے نچلے درجے کے تصورات یا اعیان کا صدور (Emanation) ہوتا ہے۔ صدور کا یہ نظریہ جس کا بانی افلاطون ہے بعد ازاں فلاطینوس کی فکر کی بنیاد بنا۔(۲۹)

افلاطون کا نظریہ تصورات پانچ اقسام پر حاوی نظر آتا ہے۔ اس کے نزدیک صرف محسوسات ہی کے تصورات یا اعیان نہیں بلکہ مجرد اوصاف کے بھی ہیں:

۱۔ اخلاقیاتی اور جمالیاتی تصورات۔ مثلاً خیر، عدل اور حسن وغیرہ۔

۲۔ عمومی تصورات (امورِ عامہ)۔مثلاً عینیت وتخالف،ہستی ونیستی،مشابہت وعدم مشابہت اور وحدت وکثرت وغیرہ۔
۳۔ ریاضیاتی (تعلیمیاتی) تصورات۔مثلاً دائرہ،مثلث،مربع،محیط،مختلف اعداد وغیرہ۔
۴۔ مختلف طبعی انواع (طبیعیات) کے تصورات۔مثلاً انسان،بیل،پتھر وغیرہ۔
۵۔ مختلف النوع مصنوعات کے تصورات۔مثلاً میز،کرسی،وغیرہ۔(۳۰)

افلاطون کے اس نظریے میں واضح نہیں ہوتا کہ اعیان کے خدا سے ربط کی کیا نوعیت ہے۔اعیان خدا سے خارج میں وجود رکھتے ہیں یا خدا کے علم میں موجود ہونے کی صورت میں ان کی حیثیت صورِ علمیہ کی ہے۔اس بارے میں افلاطون کے ہاں تضاد پایا جاتا ہے۔ارسطو نے افلاطون کے نظریۂ تصورات میں موجود خامیوں کی بالتفصیل وضاحت کی ہے۔افلاطون کے ہاں فیثا غورث کی طرح عقل وتصوف کی آمیزش ہے لیکن ایک درجہ پر تصوف کو فوقیت حاصل ہوجاتی ہے۔افلاطون بھی فیثا غورث ہی کی طرح تناسخ کا قائل ہے۔خدا کے بارے میں افلاطون کے تصورات واضح نہیں۔وہ خدائے واحد کا قائل بھی ہے اور بتوں کا نام لیوا بھی۔البتہ جب وہ توحید پر روشنی ڈالتا ہے تو دلائل پیش کرتا ہے لیکن جب بتوں کا ذکر کرتا ہے تو روایات پر اکتفا کرتا ہے۔افلاطون کے خیال میں خدا نے تمام کائنات کو پیدا کیا اور انسان میں اپنی روح پھونکی۔(۳۱)

افلاطون خدا سے انسان کی مماثلت کو خیر برترین کہتا ہے چوں کہ خدا حقیقی خیر ہے اور عدل مطلق ہے لہٰذا ہم عدل ہی میں اس کے مشابہ ہوسکتے ہیں۔آسمان پر خداؤں کے درمیان بدیوں کو جگہ نہیں ملتی اس لیے بدیاں زمین پر ہی منڈلاتی رہتی ہیں۔سو ہمیں جتنی جلدی ممکن ہو زمین سے آسمان کی طرف پرواز کرنی چاہیے۔زمین سے ماورا پرواز کرنا ممکنہ حد تک خدا سے مماثلت ہے۔خدا کا ملاً راستی اور عدل ہے۔جس انسان میں یہ اوصاف زیادہ ہوں وہی خدا کے زیادہ مماثل ہے۔(۳۲)

افلاطون نے اپنی قبر کے ایک طرف یہ عبارت کندہ کروائی کہ ''افلاطون کا جسم بے شک زمین میں مستور ہے لیکن اس کی روح ان بلندیوں پر پہنچ چکی ہے جہاں موت کی رسائی نہیں ہوسکتی۔''(۳۳) اس سے بقاے روح پر اس کے اعتقاد کا پتا چلتا ہے۔اس کے خیال میں سچا فلسفی جو زندگی کی مادی اور جسمانی لذتوں سے آزاد ہوجاتا ہے۔اس کی روح موت کے بعد ایک غیر مرئی دنیا میں منتقل ہوجاتی ہے جہاں وہ دیوتاؤں کی مجلس میں حقیقی مسرت سے دوچار ہوتا ہے۔لیکن مادی آلائشوں میں مبتلا ناپاک روح بھوت بن کر یا گدھے اور بھیڑ کا قالب اختیار کر کے واپس آجاتی ہے۔جنت میں صرف سچا فلسفی ہی جاسکتا ہے۔جس شخص نے فلسفہ کا مطالعہ نہ کیا ہو اور دم نزع آلودگیوں سے پاک نہ ہوا سے جنت میں جانے کی اجازت نہیں۔فلسفہ کے پرستار تمام شہوات سے دور رہتے ہیں۔(۳۴) یہ آرفی عناصر افلاطون کے فلسفہ میں فیثا غورث کے ذریعے داخل ہوئے۔

افلاطون کا تصورِ عالم مثال اسلامی مابعد الطبیعیات کے اہم نمائندہ حضرت ابن عربیؒ کے نظریۂ اعیان سے حیران کن مماثلت رکھتا ہے۔شاہ ولی اللہؒ نے بھی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں عالمِ مثال کے عنوان کے تحت احادیث سے استنباط کرتے ہوے ثابت کیا ہے کہ اشیاء وواقعاتِ کائنات کی حقیقت وہ نہیں جو نظر آتی ہے بلکہ کچھ اور ہے۔نیز عالم ارواح میں انسان پر ایک زندگی گذر چکی ہے۔فصوص الحکم کے مقدمہ میں مذکور ہے کہ افلاطون سے جب پوچھا گیا کہ انبیاء کون ہیں اور کیسے ہیں تو اس نے جواب دیا کہ یہ لوگ حکماء ہیں اور ان کی حکمت کامل ہے۔(۳۵)

ارسطو (۳۸۴۔۳۲۲ق م) اپنے استاد افلاطون کی طرح مثالیت پسند ہے لیکن اس نے افلاطون کے نظریات پر نظر ثانی

کرتے ہوے انہیں واقعیت کے قریب کرنے کی کوشش کی۔ارسطو نے ''محرک لامتحرک'' کا نظریہ پیش کیا جسے ''نظریۂ تعلیل'' بھی کہا جاتا ہے۔اس کی رو سے ہر چیز اپنے مقصد یا غایت کی طرف حرکت کر رہی ہے۔ارسطو کے مطابق کسی چیز کی تخلیق اور اس کے وجود کے لیے چار علل کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ علت مادی: The Material Cause

۲۔ علت فاعلی: The Efficient Cause

۳۔ علت صوری: The Formal Cause

۴۔ علت غائی: The Final Cause

ارسطو اس کی وضاحت کے لیے سنگ تراشی کی مثال دیتا ہے۔سِل مجسمہ بننے سے قبل علت مادی ہے۔پتھر یا سل کو مجسمہ بنانے کے لیے حرکت دینے والا فاعل، سنگ تراش، علتِ فاعلی ہے۔سنگ تراش کے ذہن میں موجود کسی مجسمے کا خاکہ علت صوری ہے؛ جب کہ مکمل بت یا تیار شدہ مجسمہ علت غائی ہے جو مقصد یا نصب العین ہے جس کی طرف حرکت کا عمل بہ تدریج بڑھتا رہا ہے۔(۳۶)

ارسطو کے نزدیک خدا مادہ کی آمیزش سے پاک اعلیٰ ترین صورت ہے، دنیا میں ہر حرکت کا سبب کوئی صورت ہے۔یہ صورت اپنے سے بلند تر صورت کی طرف صعود کرتی ہے۔اس طرح وہ نچلے درجے کے لیے مادہ یا استعداد قرار پاتی ہے۔دنیا میں حرکت کہیں بھی ختم نہیں ہوتی۔اوپر کی طرف حرکت کرتے ہوے مادہ میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور نیچے کی طرف حرکت کرتے ہوے صورت میں۔آخری صورت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ان صورتوں سے گذرنا پڑتا ہے جن میں مادہ کی آمیزش برائے نام ہوتی ہے، اور پھر ان سے جو مادہ کی آمیزش سے یکسر پاک ہوتی ہیں۔اس طرح کائنات میں مادی صورتوں کی حرکت لازمی طور پر ایک آخری اور غیر متحرک صورت کی متقاضی ہے۔یہی صورت خدا ہے۔چوں کہ خدا سے برتر کوئی صورت نہیں، اس لیے اسے صعود، تغیر یا حرکت کی کوئی حاجت نہیں۔اس طرح خدا علت اولیٰ اور محرکِ غیر متحرک (The Unmoved Mover) ہے۔(۳۷)

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات (۳۸)

امین احسن اصلاحی کی تحقیق کی رو سے ارسطو خدا کی وحدانیت پر یقینِ کامل رکھتا ہے۔اس کے نزدیک خدا کائنات کا خالق بھی ہے اور کائنات کو چلانے والا بھی۔وہی محرک اول بھی ہے۔ارسطو عقل انسانی کو بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ انسان ایک نورِ یزدانی (Divine Spark) اور عقلِ ملکوتی (Divine Reason) کا حامل ہے۔انسان اگر خدائے واحد کے عطا کردہ کمالات کی تربیت اور نشو ونما پر توجہ دے تو وہ درجۂ کمال تک پہنچ سکتا ہے۔تربیت اور نشو ونما کے ذکر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو نبوت کی ضرورت کا قائل ہے۔ارسطو کے خیال میں ہر چیز کا محور خدا ہے اور مادہ کی قید سے رہائی پالینا ہر چیز کی انتہا ہے۔(۳۹)

اکثر محققین نے اس خیال کی ترجمانی کی ہے کہ افلاطون کے ''خیرِ محض'' اور ارسطو کے ''محرکِ لامتحرک'' کو الہامی معنوں

میں خدا نہیں کہا جا سکتا، ان کا خدا غیر شخصی ہے۔(۴۰)

ارسطو کے مطابق محسوسات کی دنیا ایک فریب اور نمائش نہیں۔ وہ حقیقی وجود رکھتی ہے۔ اس کے تغیرات حقیقی ہیں اور ان کی مناسب و معقول تشریح ہونی چاہیے۔(۴۱) ابن رشد کے خیال میں ارسطو بقائے روح کا قائل نہیں تھا۔ وہ کہتا ہے کہ روح جسم کے ساتھ پیوست ہے اور جسم کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے۔ وہ فیثا غورث کے نظریۂ تناسخ کا مذاق اڑاتا ہے۔(۴۲) اس کے نزدیک خیر کا حصول تمام اعمال کا مقصد اور حقیقی مسرت ہے۔ حقیقی مسرت ظاہری چیزوں مثلاً دولت و عزت یا عیش و عشرت سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ غور و فکر یا فلسفہ سے حاصل ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ مسرت بخش اور موزوں ترین زندگی وہ ہے جو ذہنی سلامت روی سے عبارت ہو۔(۴۳) قفطی کے مطابق افلاطون ارسطو کو تمام شاگردوں سے بہتر سمجھتا اور اسے ''عقلِ مجسم'' کہتا۔(۴۴) البیرونی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندر اعظم نے ہندوستان فتح کرنے کے بعد برہمنوں کو ارسطو کے پاس بھیجا تا کہ وہ مذہبی عقائد کے بارے میں ارسطو سے مباحثہ کریں۔ ان کے جواب میں ارسطو نے ایک رسالہ لکھا جس میں بتوں کے لیے قربانی اور بتوں میں روحانیت موجود ہونے کے عقیدے سے انکار کیا۔(۴۵) اس سے ارسطو کے خدا کی وحدانیت پر یقین کا گمان گذرتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وحی ربانی کے اثرات کسی حد تک یونانیوں پر بھی تھے۔ ممکن ہے سقراط کی سزائے موت سے خائف ہو کر افلاطون اور ارسطو نے دیوتا پرستی کی مخالفت نہ کی ہو کیوں کہ اس دور میں دیوتا پرستی کو ریاستی و حکومتی مذہب کی حیثیت حاصل تھی۔

فلسفہ یونان کی مابعد الطبیعیاتی فکر کا ایک نمائندہ مصری فلسفی فلاطینوس (۲۰۴ء۔۲۷۰ء) ہے۔ جس نے نظریۂ صدور پیش کیا۔ وہ خدا، عقل اور روح کی تثلیث کا قائل ہے۔ لیکن اس کی تثلیث کے ارکان عیسائیت کی تثلیث کی طرح ہم رتبہ نہیں۔ خدا بلند ترین مقام پر ہے۔ اس کے بعد بالترتیب عقل (Nous) اور روح کا مقام ہے۔ فلاطینوس کے مطابق خدا واحد ہے۔ ہر قسم کی حرکت، کثرت، امتیاز، ارادہ اور خواہش سے پاک ہے۔ اسے واحد اور خیر جیسے الفاظ میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ الفاظ اس کے لیے استعارۃً استعمال ہوتے ہیں۔ وہ اس قدر ماورا ہے کہ مادی دنیا سے براہ راست تعلق نہیں رکھ سکتا۔ کائنات اس سے اس طرح صادر ہوتی ہے جس طرح سورج سے روشنی چھلک پڑتی ہے۔ ذاتِ احد سے عقل یا ذہن کا صدور ہوتا ہے۔ عقل سے روح کائنات کا صدور ہوتا ہے، جو مادہ سے مل کر ذی روح اشیاء کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مادہ سے کائنات کی تمام اشیاء کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے، جب کہ روح انہیں صورت بخشتی ہے۔ مادہ ذاتِ احد کے مقابلہ میں مستقل حیثیت کا مالک نہیں۔ جس طرح چراغ سے فاصلہ بڑھتا جائے تو اندھیرا وجود میں آتا ہے، اسی طرح ذاتِ احد سے دوری کی وجہ سے مادہ وجود میں آتا ہے۔ کائنات خود ذاتِ احد نہیں لیکن ذاتِ احد سے جدا بھی نہیں۔(۴۶) فلاطینوس نے افلاطون کے فلسفیانہ خیالات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس کے صوفیانہ نظریات کو اختیار کیا۔ اس کے مکتب فکر کا بانی امونیس ساکاس (Ammonius Saccas:م۲۴۲ء) خیال کیا جاتا ہے لیکن اس گروہ میں مشہور ترین فلسفی فلاطینوس ہے۔ حتیٰ کہ اسے اس مکتب کا بانی سمجھا گیا۔(۴۷) فلاطینوس کے مطابق عقل و حکمت گر دِراہ اور نورِ باطن وصالِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ فلاطینوس کا دعویٰ تھا کہ حالتِ استغراق میں کئی مرتبہ اسے روحِ کل سے وصال نصیب ہوا لیکن یہ لمحات عارضی ثابت ہوئے۔ مادہ کی کشش روح کو دوبارہ عالم سفلی میں کھینچ لائی۔(۴۸) یوسف سلیم چشتی نے اس عمومی خیال کی تردید کی ہے کہ شنکر اور فلاطینوس کی فکر میں

حلول پایا جاتا ہے۔(۴۹)

حاصلِ بحث یہ ہے کہ یونان میں مابعدالطبیعیاتی تفکر کا آغاز مادیت سے ہوا۔ طالیس ملطی نے پہلی مرتبہ مبداء کائنات پر غوروخوض کرنے کا آغاز کیا۔ یونانی فلسفیوں کے مادہ پرست گروہ کے نزدیک کائنات سالماتِ مادی کے امتزاج سے خود بہ خود پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا کوئی خالق نہیں۔ فیثا غورث، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے ہاں خدا کا تصور موجود ہے۔ سقراط توحید کے قریب قریب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن افلاطون وہ پہلا مفکر ہے جس نے عالم مثال کا ایسا تصور پیش کیا جو اسلامی نقطہ نظر سے بھی درست ہے۔ فلاطینوس افلاطون کی پیروی میں نظریۂ صدور کا قائل ہے، جس کی رو سے کائنات حقیقتِ مطلقہ سے صادر ہوتی ہے۔ یونانی مابعدالطبیعیات کا ایک اہم کارنامہ اخلاقیاتی اور انسانیاتی تفکر کی داغ بیل ڈالنا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وہاب اشرفی، پروفیسر، تاریخ ادبیاتِ عالم، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، جلد اول، ص:۹۱

۲۔ ایڈولف ہولم، تاریخ یونان قدیم، مترجم: محمد ہارون خان شیرانی، نفیس اکیڈمی، اردو بازار کراچی، ۱۹۸۷ء، حصہ اول، ص:۱۵۹

۳۔ ہومر، جہاں گرد کی واپسی، مترجم: محمد سلیم الرحمٰن، مکتبہ جدید لاہور، بار اول ۱۹۶۴ء

۴۔ الفرڈ ویبر، تاریخ فلسفہ، مترجم: ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن)، ۱۹۲۸ء، ص:۴۵

۵۔ گمپرز، Great Thinkers (یونانی اہل فکر) مترجم: لاری میگنس بہ حوالہ: ریپو پارٹ، فلسفہ کی پہلی کتاب، مترجم: ڈاکٹر میر ولی الدین، محولہ بالا، ص:۵۲

۶۔ برٹرینڈ رسل، فلسفہ مغرب کی تاریخ، مترجم: پروفیسر محمد بشیر، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص:۳۰

۷۔ ریپو پارٹ، فلسفہ کی پہلی کتاب، محولہ بالا، ص:۵۳

۸۔ Zeller, Edward, Outline of the History of Greek Philosophy, London, 1955, P.15

۹۔ یاسر جواد، فلسفیوں کا انسائیکلو پیڈیا، بک ہوم، مزنگ روڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۳۱، ۳۲

۱۰۔ قفطی، جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف، تاریخ الحکماء، مترجم: ڈاکٹر غلام جیلانی برق، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۲ء، ص:۳۵۱

۱۱۔ قیصر الاسلام، قاضی، فلسفے کے جدید نظریات، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۵۱۹

۱۲۔ برٹرینڈ رسل، فلسفہ مغرب کی تاریخ، محولہ بالا، ص:۶۵

۱۳۔ ایضاً، ص:۶۵، ۶۶

۱۴۔ الفرڈ ویبر، تاریخ فلسفہ، محولہ بالا، ص:۵۱

۱۵۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، تاریخ فلسفہ یونان، علمی کتاب خانہ، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۹ء، ص:۸۷
ایک رائے یہ بھی ہے کہ ''خود را بشناس'' طالیس ملطی کا مقولہ ہے جسے سقراط نے اختیار کیا۔

۱۶۔ الفرڈ ویبر، تاریخ فلسفہ، محولہ بالا، ص:۵۳، ۵۴

۱۷۔ محمد سلیم الرحمٰن، مشاہیرِ ادب، قوسین، سرکلر روڈ لاہور، ۱۹۹۲ء، ص:۳۱۲

۱۸۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، تاریخ فلسفہ یونان، محولہ بالا، ص:۸۵
''سوفسط'' کا مطلب دانش وریا معلمین دانش یا اصحابِ دانش ہے۔ سقراط، سوفسطائیوں کے برعکس جہلِ بسیط کا معترف تھا۔ وہ اپنے دوستوں یا شاگردوں سے مناظرانہ گفتگو کر کے یہ نتیجہ نکالتا تھا کہ ہم حقائق کے علم سے بے بہرہ ہیں۔ سوفسطائیوں کی غلطیوں کی نشان دہی سقراط پر سوفسطائیوں کے برافروختہ ہونے کا سبب بنی۔ ذیل کے فارسی اشعار میں انسانی علم کے محدود ہونے کی نہایت عمدہ عکاسی کی گئی ہے:

آں کس کہ بداند و بداند کہ نداند
اسپ طرب خویش بر افلاک جہاند
آں کس کہ نداند و بداند کہ نداند
آں نیز خر خویش بمنزل برساند
واں کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابدالدھر بماند

۱۹۔ پال ژانے/گریل سیلے، تاریخ مسائل فلسفہ، مترجم: ڈاکٹر میر ولی الدین، سٹی بک پوائنٹ، اردو بازار کراچی، ۲۰۰۸ء، ص:۲۱
۲۰۔ قفطی، تاریخ الحکماء، محولہ بالا، ص:۲۸۳، ۲۸۴
۲۱۔ محمد سلیم الرحمٰن، مشاہیر ادب، محولہ بالا، ص:۳۱۳
۲۲۔ برٹرینڈ رسل، فلسفہ مغرب کی تاریخ، محولہ بالا، ص:۱۲۳، ۱۲۴
۲۳۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر، سرگذشتِ فلسفہ، فیروز سنز لاہور، حصہ دوم، اول، ۱۹۹۱ء، ص:۱۲
۲۴۔ قفطی، تاریخ الحکماء، محولہ بالا، ص:۴۰ تا ۴۶
۲۵۔ الفرڈ ویبر، تاریخِ فلسفہ، محولہ بالا، ص:۸۵
۲۶۔ میکش اکبر آبادی، نقد اقبال، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص:۵۲
۲۷۔ سی اے قادر، ڈاکٹر، فلسفہ جدید اور اس کے دبستان، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص:۴۹
۲۸۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، تاریخ فلسفہ یونان، محولہ بالا، ص:۱۱۳، ۱۱۴
۲۹۔ ایضاً، ص:۱۱۵، ۱۱۶
۳۰۔ A Wedberg, "The Theory of Ideas" in G. Vlastos (ed.), Plato I. P.35-36
بہ حوالہ: ساجد علی، شاہ اسماعیل شہید کی مابعد الطبیعیات، مقالہ: پی ایچ۔ڈی، مملوکہ: پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۹۸ء، ص:۶۳۔۶۴
۳۱۔ امین احسن اصلاحی، مولانا، فلسفے کے بنیادی مسائل۔قرآن حکیم کی روشنی میں، ترتیب: محبوب سبحانی/خالد مسعود، فاران فاؤنڈیشن لاہور، اول، ۱۹۹۱ء، ص:۲۴
۳۲۔ الفرڈ ویبر، تاریخ فلسفہ، محولہ بالا، ص:۸۳
۳۳۔ قفطی، تاریخ الحکماء، محولہ بالا، ص:۵۲
۳۴۔ برٹرینڈ رسل، فلسفہ مغرب کی تاریخ، محولہ بالا، ص:۱۸۶
۳۵۔ ابن عربی، فصوص الحکم، مترجم: مولانا حافظ محمد برکت اللہ رضا فرنگی محلی، اقبال پبلشرز حیدر آباد کالونی کراچی، س ن،

مقدمہ،ص:۵۴،۵۵

۳۶۔ Stace, W.T., A Critical History of Greek Philosophy, Mac Millan & Co. London, 1962, P.268

۳۷۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، تاریخ فلسفہ یونان، محولہ بالا، ص:۱۵۸،۱۵۹

۳۸۔ محمد اقبال، علامہ، بال جبریل، ساقی نامہ

۳۹۔ امین احسن اصلاحی، فلسفے کے بنیادی مسائل، ترتیب: محبوب سبحانی / خالد مسعود، فاران فاؤنڈیشن لاہور، اول، ۱۹۹۱ء، ص:۲۴

۴۰۔ علی عباس جلالپوری، روایات فلسفہ، تخلیقات، بیگم روڈ لاہور، ۲۰۱۰ء، ص:۸۱

۴۱۔ ایڈون اے برٹ، فلسفہ مذہب، مترجم: بشیر احمد ڈار، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، ص:۶۰

۴۲۔ برٹرینڈ رسل، فلسفہ مغرب کی تاریخ، محولہ بالا، ص:۲۱۸

۴۳۔ محمد سلیم الرحمٰن، مشاہیر ادب، محولہ بالا، ص:۶۷

۴۴۔ قفطی، تاریخ الحکماء، محولہ بالا، ص:۵۷

۴۵۔ البیرونی، ابوریحان، ہندو دھرم۔ ہزار برس پہلے، محولہ بالا، باب ۱۱، ص:۱۵۱

۴۶۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، تاریخ فلسفہ یونان، محولہ بالا، ص:۲۰۳،۲۰۴

۴۷۔ Zeller, Edward, Outline of the History of Greek, P.91

۴۸۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ فلسفہ، محولہ بالا، ص:۸۶

۴۹۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، تاریخ تصوف، محولہ بالا، ص:۱۱۰